

بارات یادوں کی

احمد جعفری

حب سب کچھ حتم ہو جائے تب بھی آخر میں انسان کے پاس ایک خزانہ بچ جاتا ہے اور وہ ہے یادوں کا... گزشتہ گوری زندگی کے بے شمار لمحات میں سے کچھ خاص پل زندگی کا بہت قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں... یہ خزانہ خرچ کرے سے کبھی کم نہیں ہوتا بلکہ مرید اضافے کے ساتھ یادوں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ اسے بھی زندگی کے کچھ قیمتی لمحات بہت عزیز تھے۔ جنہیں اس نے آخری سانس تک بہت سنبھال کر رکھا۔

ماضی کے اوراق پر کہانیوں کے چلتے پھرتے کرداروں کا بحارم

شہر قائد لندن۔ مقام بی ہائیڈرل کورٹس۔ پندرہ منزلہ بلڈنگ کا نام بیٹھائینٹن۔ اس بلڈنگ کے ساتویں فلوور کے کٹوری اپارٹمنٹ میں 80 سالہ پاکستانی نژاد بریٹش حیدر علی تھا بیٹھا اپنے ماضی کے اوراق الٹ رہا تھا۔

حیدر علی 1964ء کے آخر میں کراچی یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کرتے ہی لندن شفٹ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پاکستانیوں کا لندن جانا بہت آسان تھا۔ لندن کے امپورٹ پر ہی انگلینڈ کا چھ ماہ کا ویزا دے دیا



جاتا تھا۔

خواب۔ چاروں جانب خون ہی خون۔ کئی ہوئی گردنیں، ترپتے ہوئے لاشے۔ گھروں کو آگ لگی ہوئی تھی۔

حیدر علی کا پورا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ ”یامیرے مولا! یہ کیسا خواب تھا۔“ اس نے فریج سے بوتل نکال کر ٹھنڈا پانی پیا۔ کچھ پانی چہرے پر ڈالا۔

اس نے وقت گزارنے کے لیے فی دی آن کیا اور بی بی سی نیوز چینل لگایا۔ پہلی خبر سننے ہی اس کی چیخ نکلی تھی۔

”ہائے میرا پاکستان۔ ہائے میرا پاکستان۔“

اس کی بیوی نوشاہیہ بھی ٹھہرا کر اٹھ گئی۔ ”کیا ہوا۔ کیا ہو اعلیٰ۔ بتاتے کیوں نہیں ہو؟“

حیدر علی نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا بتاؤں خود دیکھ لو۔ میرا پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ مارک ٹیلی کھ رہا ہے پاکستان کٹ ٹوڈی سائز۔ ان کو کیا خبر کتنے لاکھ مسلمانوں نے اس کو حاصل کرنے میں اپنی جائیں قربان کی تھیں۔ اپنا مستقبل تباہ کر لیا تھا، ان کو کیا خبر۔“

حیدر علی کئی دن تک روتا رہا۔ رات بھر بے چینی سے کمرے میں ٹھہلتا رہتا تھا۔ نوشاہیہ اسے تسلی دیتی رہی تھی۔

”میرے گھر علی۔ خدا کی بھی مرضی تھی؟“

”نہیں نوشاہیہ نہیں۔ یہ خدا کی مرضی نہیں تھی۔ ہم نے خود آگ لگائی ہے اپنے چمن کو۔“

نوشاہیہ اسے ہائی پاور کی سکون آور دوا دیتی تھی۔ اس بلڈنگ میں کئی پاکستانی خاندان رہتے تھے۔ برابر والے فلیٹ میں ایک بھاری خاندان آباد تھا۔ ان کے دو بھائی مع فیملی کے ڈھاکہ میں رہتے تھے۔ برابر والے فلیٹ سے رات کو عورتوں کے رونے پسینے کی آوازیں آتی تھیں جن کو سن کر حیدر علی بھی رونے لگتا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد ریڈ کراس نے خبر دی کہ ان کے ایک بھائی کو کئی باہنی نے سلاٹر ہاؤس میں لے جا کر قتل کر دیا ہے جبکہ باقیوں کو کیپسوں میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ کیپسوں کی زندگی کسی بھی اس کے مناظر بی بی سی دکھاتا رہتا تھا۔

حیدر علی کو کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ رات کو نیند کی حالت میں بڑبڑاتا تھا۔ ”خوف ہے۔ خوف ہے۔ اندیشہ ہے۔ اندیشہ ہے۔ مکتی باہنی۔ مکتی باہنی۔ جنگی قیدی۔ جنگی قیدی۔“

اس بلڈنگ میں رہنے والے دوسرے پاکستانی خاندانوں کا رویہ عجیب و غریب اور انتہائی تکلیف دہ تھا۔ وہ کہتے تھے۔ ”بنگالی مجھو را چلا گیا، اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“

حیدر علی کا تعلق ہندوستان کے اس طبقے سے تھا جس نے اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کر دیا تھا۔ اپنا کلچر، اپنی سوسائٹی، اپنی زمینیں، اپنا مکان، اپنا کاروبار، بزرگوں کی قبریں۔ سب کچھ بچھا کر کے یہ سرزمین حاصل کی تھی۔ جب اس کے کان میں ”آگے سمندر ہے“ کی آواز پڑی تو اس نے برٹش انر کالکٹ خرید لیا اور کئی سمندر عبور کرتا ہوا لندن بھاگ گیا۔ اس وقت حیدر علی کی عمر 24 سال کے قریب تھی۔

لندن میں شروع کے چند ماہ بڑی کسپری میں گزرے۔ بہر حال یہ مشکل وقت بھی گزر گیا۔ حیدر علی کو ایک بہت بڑی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ یہاں مختصر آدی کے لیے ترقی کی بڑی گنجائش تھی۔ حیدر علی میں محنت کی کمی نہیں تھی۔

تین سال بعد اس کی شادی ایک نہایت حسین و جمیل ایرانی نژاد برطانوی لڑکی سے ہوئی۔ کردوبائل سے تعلق رکھنے والی نوشاہیہ تیرہ بڑی پیشے کے لحاظ سے کوالیفائیڈ نرس تھی۔ شادی کے بعد جلد ہی حیدر علی کو برطانیہ کی شہریت مل گئی۔

حیدر علی اپنی کمپنی میں ترقی کرتے کرتے فیلڈ آفیسر بن گیا۔ اچھی تنخواہ اور دیگر الاؤنسز۔ اس کی زندگی کا سنہرا دور شروع ہو چکا تھا۔

نوشاہیہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ نوشاہیہ کی زبان سے جدید فارسی سن کر حیدر علی کو احساس ہوا کہ فارسی زبان کتنی شیریں ہے۔ تین مہینے میں حیدر علی بھی فارسی بولنے اور سمجھنے لگا تھا۔

نوشاہیہ نے اسے دو بیٹے اور ایک بیٹی کا تحفہ دیا۔ جب حیدر علی ستر سال کی عمر کو پہنچا تب تک نوشاہیہ بدوونو بیٹیوں اور بیٹی کی شادیاں اچھے مہذب گھرانوں میں کرا چکی تھی۔ دونوں بہت متکبرانہ تھے۔

ستر سال کی عمر میں حیدر علی کو دلچراش صدمہ سہنا پڑا۔ اس کی پیاری بیوی نوشاہیہ قلیل علالت کے بعد موت کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ حیدر علی بہت رویا مگر جلد ہی صبر کی منزل پر پہنچ گیا۔

حیدر علی کے لیے یہ دوسرا صدمہ تھا۔ پہلا صدمہ تو اس کے دل و دماغ میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ پہلا صدمہ کیا تھا۔ 16 دسمبر 1971ء کی تاریخ تھی۔ صبح کے چار بجے تھے۔ حیدر علی گہری نیند میں خواب دیکھ رہا تھا۔ خوفناک

حیدر علی چلا آگیا تھا۔ ”یا اللہ رحم۔ یا اللہ رحم۔“

☆☆☆

حیدر علی کا ذہن کچھ اور پیچھے چلا گیا۔ وہ کمپنی میں اچھی پوزیشن پر آگیا تھا۔ اس کی کمپنی گلوبل ایکسپورٹ اپورٹ کارپوریشن بے شمار ایشیا کوڈیل کرتی تھی۔ اس کے سب آفسز اور ایجنٹ پوری دنیا میں بھیلے ہوئے تھے۔ آسٹریلیا سے اون، فلپائن سے خاص بھیلی، کیکڑے اور بڑے جھینگے، پاکستان سے جوٹ (پٹ سن) اور روٹی، ایران و افغانستان سے ڈرائی فروٹس اور جانوروں کی ہائیڈر ایڈ اسکن (کھالیں)، چائنا سے ہر بل میڈیسن وغیرہ اپورٹ کی جاتی تھیں۔ انگلینڈ سے مشینیں اور تیار ایشیا ایکسپورٹ کی جاتی تھیں۔

کمپنی کا ہیڈ آفس لندن میں پکا ڈی سرکس کے پوش علاقے میں تھا۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ صبح کے آٹھ بجے تھے۔ شدید سردی تھی۔ لندن میں ہلکی برف باری کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔

حیدر علی انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے ہیں بچپس آدمیوں پر مشتمل ایک ٹرولر گزر رہا تھا۔ جلوس میں شامل گورے مردوں اور لڑکیوں کا حلیہ دیکھ کر حیدر علی بڑی دلچسپی اور حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔ جلوس کے آگے چار سادھویک لائن بنائے چل رہے تھے۔ لمبی لمبی ڈاڑھیاں، گھٹی موچھیں، سرگمجا، سر پر صرف ایک چوٹی تھی۔ ان کے جسم پر ایک سفید جھوٹی سی دھوٹی تھی۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں۔ چاروں کے گلے میں لمبے ڈھول لنگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بیس کے قریب گورے مرد اور نو جوان لڑکیاں تھیں۔ سب نے مختصر سی سفید دھوٹی لپیٹ رکھی تھی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔

عجب دلکش منظر تھا۔ حیدر علی ان کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ آگے چلنے والے سادھو ڈھول بجا رہے تھے اور شاید کوئی بھجن الاپ رہے تھے۔ حیدر علی کو صرف ایک جملہ سمجھ میں آیا۔ ”بولو ج شام۔ ہرے سیتا ہرے رام۔“ پیچھے چلنے والے گورے اور گوریاں بھی بول رہے تھے۔ ”ہرے سیتا۔ ہرے رام۔“ ساتھ میں گوریاں ڈھول کی تھاپ پر منک رہی تھیں۔

حیدر علی کے لیے یہ منظر بڑا دلچسپ اور حیران کن تھا۔ شدید سردی، مختصر سی دھوٹی، پاؤں میں نہ موزے نہ جوتے، صرف لکڑی کی کھڑاویں۔

اسی اثنا میں اسے ایلس سامنے سے آتی نظر آئی۔ ایلس اس کی سیکریٹری تھی۔ نوعمر، خوبصورت، ہنس مکھ۔ اس نے قریب آتے ہی طنز کا تیر چلایا۔ ”مسٹر علی اتم یہاں کھڑے ہوئے دو جرم کر رہے ہو۔ ایک اخلاقی دوسرا قانونی۔ تم غیر عیم رپاں گوریوں کو تاک رہے ہو۔ یہ بات یہاں بہت بری سمجھی جاتی ہے۔ دوسرا قابل سزا قانونی جرم۔ دوسرے کے مذہبی معاملات میں مداخلت۔“

”ایلس! مجھے گوریوں کو تاکنے کی ضرورت ہے ہی نہیں۔ تم روزانہ آٹھ گھنٹے موزے اور جوتے اتار کر میرے کمرے میں گھومتی رہتی ہو۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔“ ایلس نے قہقہہ لگایا۔ ”اور دوسرا جرم؟“

”میں ان کے مذہبی معاملے میں بالکل دخل نہیں دے رہا۔ میں تو پریشانی کی حد تک حیران ہوں۔ اتنی سخت سردی۔ ایلس اتم ان کا حلیہ دیکھو۔ مختصر سی دھوٹی، پاؤں میں نہ موزے نہ جوتے، صرف لکڑی کی کھڑاویں۔ آخر انہیں سردی کیوں نہیں لگ رہی؟“

”مسٹر علی اتم خود بھی ان ہی کے علاقے کے رہنے والے ہو۔ ہاں پہاڑوں پر بڑی یوٹیلٹی ہیں جن سے یہ سادھو لوگ جنہیں گرو بھی کہا جاتا ہے، ایسا مشروب بناتے ہیں کہ اس کا ایک گلاس بھی کوئی پی لے تو وہ برف کی سیل پر لیٹ کر آرام سے سو سکتا ہے۔ میں نے خود اس کا تجربہ کیا تھا۔ جب میں سترہ اٹھارہ سال کی تھی تو شوق ایک ایسے ہی گروپ میں شامل ہو گئی تھی۔ میں نے وہ مشروب پیا تھا۔ بس نہ پوچھو کہ کیا ہوا۔ گھر آکر اپنے کمرے میں گرمی سے بے حال ہو کر بھٹی رہی۔ گرو کی ہدایت کے مطابق صرف ٹھنڈا دودھ پیتی تھی، پانی منع تھا۔ میں دودھ کی دو بڑی بوتلیں پی گئی مگر مجھے چین نہیں آیا۔ میں نے گرو کو فون کیا۔ اس نے کہاں اب ایک ہی علاج رہ گیا ہے۔ اپنے بوائے فرینڈ کو بلاؤ۔ میں نے فوراً رابرٹ کو فون کیا۔ وہ تو خوشی سے اچھل پڑا۔ صرف پندرہ منٹ میں وہ میرے کمرے میں تھا۔ جب صبح ہوئی تو میں اس کے سینے پر سر رکھ سکون سے سو رہی تھی۔ پتا ہے زابرٹ نے کیا کہا۔ ایلس! اگلے ویک اینڈ پر یہی مشروب پھر پینا۔“ ایلس اپنا قصہ سن کر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

حیدر علی مسکرایا۔ ”ایلس! یہ تو بتا دو کہ تم میری تلاش میں کیوں آئی تھیں؟“

ایلس نے پیشانی پر ہتھیلی ماری۔ ”اوہ! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ دراصل آفس میں لگی تمہارا بے چینی سے انتظار

بھائیوں سے ملا اور شام کو پی آئی اے کے ذریعے پشاور چلا گیا۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے پی آئی اے کے ہجاس سینٹر نوکر جہاز کے ذریعے کابل روانہ ہوا۔ جہاز میں صرف تین چار پاکستانی مسافر تھے، باقی سب غیر ملکی گورنہ تھے۔ تمام راستے موسم بہت خراب رہا لیکن چالیس منٹ کے بعد جہاز خیریت سے کابل ایئر پورٹ پر اتر گیا۔

غلام سبحانی نے اسے رلیو کیا۔ اس کے ساتھ ایک انتہائی حسین لڑکی کو دس نوڑا انیدہ بچی لیے کھڑی تھی۔ سبحانی نے کہا: ”علی! ان بچے ملو۔ یہ شیریں ہیں۔ تمہاری بھابی اور تمھی بچی تمہاری بیٹی ہے، رخسانہ۔“ ”ارے واہ اتم نے شادی کر لی اور ماشاء اللہ خوب صورت بچی کے باپ بن گئے۔ مجھے معلوم ہوتا تو بھابی کے لیے کوئی نہ کوئی کٹ لے آتا۔ بہر حال تمہیں مبارک ہو اور بھابی آپ کو بھی مبارک ہو۔“

کار میں بیٹھتے ہوئے حیدر علی نے خاموشی سے پوچھا: ”ہاں بھی ایس جی اتم نے میرے لیے کس ہوٹل میں بنگلہ کرائی ہے؟“ ”تم ہمارے گھر میں اسنے کرو گے۔ یہاں صرف ایک فائیو سٹار ہوٹل ہے جو ٹلی بڈ ہے اور بھی گزارے لائق ہوٹل ہیں تم وہاں پریشان ہو جاؤ گے۔“

وہ کنگ ظاہر شاہ کا زمانہ تھا۔ ہر طرف اسن واماں تھا۔ مغربی سیاح بہت بڑی تعداد میں آتے تھے۔ وہ صرف حشیش، فیون اور ہیرون کے چکر میں آتے تھے۔ صرف ایک باروق بازار تھا جس میں تقریباً تین سو دکانیں تھیں۔ دس بارہ کو چھوڑ کر باقی سب کے مالکان سکھ تھے۔ یہ دکانیں انڈین کپڑے، جاپانی الیکٹریکل گڈس اور کرکاری سے بھری ہوئی تھیں۔

زمنی راستے سے بہت پاکستانی کابل آتے تھے۔ وہ انڈین کچڑہ دیکھنے، انڈین کپڑا یا جاپانی الیکٹریکل سامان خریدتے تھے۔

ایئر پورٹ سے شہر تک دو روے بڑک بہت اچھی تھی۔ غلام سبحانی کا گھر دیکھ کر حیدر علی کو خوشی ہوئی۔ نسبتاً پوش علاقے میں دو بیڑہ رومز اور ایک گیسٹ روم کا صاف سہرا مکان تھا۔ ہر کمرے میں آتش دان تھے۔

سبحانی کی بیوی کا تعلق بھی کراچی سے تھا۔ دونوں میاں بیوی روائی سے افغانی فارسی بولتے تھے۔

بچ کے بعد حیدر علی اور سبحانی کار میں شہر کی سیر کو نکلے۔ شیریں بھی ساتھ تھی۔ بہت چھوٹا سا صاف سہرا شہر

کر رہا ہے۔“ ”ہاس کو میرے بغیر چین ہی نہیں آتا۔ کل رات کو ہی میں اٹھی سے آیا ہوں اس لیے آج میرا آف ہے لیکن صبح ہی صبح اس نے فون کر دیا۔ چلو دیکھتے ہیں، کئی کو کیا تکلیف ہے؟“

حیدر علی کے سیکشن کا ہاس کی خالص انگریز، چھنٹ سے نکلا ہوا قد، بڑی بڑی بھوری آنکھیں، بھوری گھٹی موچیں۔ کام کی بنا پر وہ حیدر علی سے محبت بھی بہت کرتا تھا۔ آفس کی لڑکیوں نے اس کا خفیہ نام ”بھورا بڈا“ رکھا ہوا تھا۔ کئی کو بہت زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ بے ٹکانہ گفتگوں بولتا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں کہتا تھا۔ ”علی! آر یو یو؟“ یعنی تم مجھ سے ایگری کرتے ہونا؟ حیدر علی اس کی بولنے کی بیماری سے بہت عاجز تھا۔

حیدر علی اور ایس باتیں کرتے ہوئے آفس میں داخل ہوئے علی فوراً کئی کے کمرے میں پہنچا۔ کئی نے سگار منہ سے نکالا۔ حیدر علی کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔ ”علی! مجھے معلوم ہے کہ آج تمہارا آف ہے مگر کیا کروں یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ علی! آج تمہیں چند دن کے لیے کابل جانا ہوگا۔ وہاں ہمارا ایجنٹ ایس جی سب سب بانی (سبحانی) بہت پریشان ہے۔ اسے پریشان تو ہونا چاہیے۔ وہ بھی تمہاری طرح پاکستانی ہے۔“ یہ کہہ کر کئی نے تہہ لگا یا۔

حیدر علی، ایس جی سبحانی سے واقف تھا۔ تین سال پہلے جب وہ انٹرویو کے لیے لندن آیا تھا تو اسی کے گھر پر ٹھہرا تھا۔ درمیانہ قد، سولوارنگ، ہر وقت سفید قمیص پر لال ٹائی پہنتا تھا۔ منہ بنا کر چپا چپا کر انگش بولتا تھا۔ بہر حال غلام سبحانی سلیکٹ ہو گیا اور کابل میں کمپنی کے چھوٹے سے آفس میں پوسٹ کر دیا گیا تھا۔

”مسٹر علی! پریشانی یہ ہے کہ“ کئی نے سگار کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”افغانیوں سے ہائیڈرائڈ اسکن کے ”وعدے“ کے سووے ہوئے تھے۔ ان کو بچپن سے پرسنٹ ادا بھی تھی مگر وہی تھی۔ اب یہ افغانی وعدے کے سووے کو فائل کرنے میں روڑے انکار رہے ہیں۔ تم جا کر دیکھو کہ کیا مسئلہ ہے۔ اگر چار پانچ پرسنٹ ریٹ بڑھانا پڑے تو بڑھا دینا۔ یہ افغانی چھی بچی چاہتے ہیں۔ گڈ بائی ایڈنگڈنگ۔“

☆☆☆

حیدر علی برٹش ائیر سے کراچی پہنچا۔ ماں باپ، بہن

تھا۔ بازاروں میں غیر ملکیوں اور پاکستانیوں کا رش تھا۔ کچھ افغانی عورتیں بھی نظر آئیں۔ سفید خیمہ ٹائپ کا برقع اوڑھے ہوئے۔

شہر کے دونوں جانب بہت بلند پہاڑ تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ایک پہاڑ پر ہرے بھرے درخت تھے۔ چوٹی تک جانے کے لیے بل کھائی پکی سڑکیں۔ چوٹی پر ایک رہائشی ہوٹل اور ریسٹورنٹ تھا جبکہ دوسرا پہاڑ بالکل چھیل تھا۔ صرف گھاس تھی۔

سجانی نے بتایا کہ دونوں پہاڑوں پر برف گرتی ہے۔ گرین پہاڑ پر برف کئی ماہ تک جچی رہتی تھی جبکہ دوسرے پہاڑ پر برف گلتی نہیں۔ برف باری میں وقفہ آتے ہی پھسل جاتی ہے۔ لوکل افغانی کہتے ہیں کہ یہ سویا ہوا آتش فشاں پہاڑ ہے۔

شام کو انہوں نے ہائیڈے ان میں جائے ملی۔ چائے پینے کے دوران سجانی نے بتایا کہ تم رات کو میرے ساتھ پہاڑی ریسٹورنٹ چلنا۔ اس کے مالک دلبر خان نے کھانے پر بلایا ہے۔ وہی ہمارا کلائنٹ بھی ہے۔

شام سات بجے دونوں دلبر نے ریسٹورنٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ رات کی سیاہی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ شدید سردی تھی۔ ایس جی (حیدر علی اکیلے میں اسی نام سے سجانی کو مخاطب کرتا تھا) اپنی یونیفارم میں تھا یعنی سفید قمیض اور لال ٹائی کے اوپر کوٹ پھر اوور کوٹ۔ حیدر علی بھی گرم کپڑوں میں بیک تھا۔

وہ بل کھائی سڑکوں سے گزرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے میں ہوٹل پہنچے۔ پارکنگ میں صرف چند کاریں تھیں۔ ایک نو رست بس بھی کھڑی ہوئی تھی۔ ریسٹورنٹ کا ہال کافی بڑا اور گرم تھا۔ چاروں کونوں میں آتش دان دھک رہے تھے۔ ایک کونے میں دلبر خان کا دفتر تھا۔ ہال کے اوپر ہانسی کمرے تھے۔ اس وقت ریسٹورنٹ میں چند گورے کافی کیا رہے تھے۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی سی جگہ پر کوئلے دھک رہے تھے۔ ان کے اوپر ایک ذبح کیا ہوا بکرا کمرے کے بل بندھا ہوا تھا۔ کمرے کے پیٹ میں چاول بھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک بڑی پلیٹ میں دو چھریاں اور دو بڑے چمچے رکھے ہوئے تھے۔ ایس جی نے بتایا کہ یہ یہاں کی خاص ڈش ہے جسے شاید بھی کہتے ہیں۔

دلبر خان اپنے دفتر سے نکلا اور دونوں کو دیکھ کر ان

کی طرف آیا۔ ”آؤ آؤ یا اراں خوش آمدید۔ تم ٹھیک وقت پر آیا۔ تمہارے واسطے خاص ڈش بنایا ہے، بالکل تیار ہے۔“

ایس جی نے تعارف کرایا۔ ”یہ حیدر علی ہیں۔ لندن ہیڈ آفس سے خاص طور پر تم سے بات کرنے آئے ہیں۔ یہ فارسی بہت کم جانتے ہیں۔“

دلبر خان نے کج بوشی سے حیدر علی کو گلے لگایا اور مصافحہ کیا۔ ”وٹکم وٹکم منڑلی! اگر فارسی نہیں جانتے تو پروا نہیں، ہم تو اردو بول سکتا ہے۔ ہم پشاور جاتا رہتا ہے، وہاں ہمارا لوگ ہے۔ وہ لوگ پشٹو بولتا ہے، فارسی بولتا ہے اور یہ کرکشی زبان۔ اردو بھی بولتا ہے۔ وہاں ہمارا خاص کاروبار ہے۔“

دلبر خان پورے افغانی لباس میں تھا۔ شلوار قمیض کے اوپر روٹی والی لوٹل جیکٹ۔ سرخ و سفید چہرے پر ہلکی سی کالی ڈاڑھی۔

دلبر خان نے کہا۔ ”یارا! ادھر کا رواج ہے کہ پہلے مہمان کو کھانا کھلاتا، قبوہ پلاتا ہے۔ یہاں ہر ٹائپ کا ڈرنک ملتا ہے۔ مہمان بولے تو وہ بھی پیش کرتا ہے۔ بزنس کی بات بعد میں کرتا ہے۔“

”بھائی! دلبر! ادھر ہمارا ہیڈ آفس والا بہت پریشان ہے کہ وعدے کا سودا پورا کیوں نہیں ہو رہا؟“

”اس فرم کی انگریز کو پریشان ہونے دو۔ بس تم پریشان مت ہونا۔ سب کام ہو جائے گا۔ آؤ کھانا کھاتے ہیں۔“

حیدر علی نے پلیٹ اور چھری اٹھائی اور گوشت کے دو بار پے کاٹ کر پلیٹ میں رکھ لیے پھر بڑے چمچے سے جمرے کے پیٹ میں بھرے چاول نکالے۔ چاولوں میں بادام، پستے بھی شامل تھے۔

تینوں اپنی اپنی پلیٹ لے کر اپنی نیمبل پر آ گئے۔

”واہ! سبحان اللہ! بہت نیٹی ہے۔“

”مزید ارے؟“ لیکن یارا! تم نے بہت کم لیا ہے۔

ہمارا لوگ تو پورا بکرا چار آدمی ختم کر دیتا ہے۔“

سجانی نے قبوہ کا گھونٹ بھرا۔ ”لیکن دلبر خان، بزنس کی بات بھی تو کرو۔ حیدر علی صاحب بہت پریشان ہیں۔“

”ضرور، ضرور یارا! بات یہ ہے کہ وعدے کے سودے میں ہمارا دو پارٹنر بھی ہے۔ وہ کل مراد شریف سے ادھر آئے گا۔ آپ سے میٹنگ کرے گا۔ اصل بات یہ ہے

اس کے بعد دلبر خان نے مسلسل جیتنا شروع کیا۔ آدھے گھنٹے میں دلبر خان نے نہ صرف اپنے ہارے ہوئے ڈالرز جیت لیے بلکہ امریکن جوڑے کے دو سو ڈالرز بھی جیت گیا۔

امریکن جوڑے کے چہرے سفید پڑ گئے۔ لڑکی نے گردن میں پہنا سونے کا پھل اتارنا شروع کیا۔ دلبر خان نے منع کر دیا۔ ”تم عورتوں کے یوڑ نہیں اتروا تا۔ یہ ہمارا اصول ہے۔ ڈالروں تو آکھیں گے کیوں نہ چل ختم۔“

دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دلبر خان نے کہا۔ ”جوڑے تمہارے لیے میرے پاس ایک جھوڑ ہے لیکن پہلے اپنی فریڈ کو پانچ منٹ کے لیے باہر بھیج دو پھر بتائے گا۔“ سبکی کے جانے کے بعد دلبر خان اور جوزف سر جوڑ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

جوزف نے کچھ سوچا اور باہر نکل گیا۔ حیدر علی اور سبحانی دھپسی سے تمام کارروائی دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جوزف اکیلا اندر داخل ہوا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ ”وہ تیار ہے۔“

دلبر خان نے کہا۔ ”گڈ“ اپنے ہارے ہوئے ڈالرز اٹھا لیا اور ڈانگ ہال میں جا کر اطمینان سے کافی پیو۔ فکر مت کرو، ہم تمہیں وہ چیز بھی دے گا جس کے لیے تم ادھر آیا ہے۔ وہ بھی بالکل مفت۔ ہم مہمانوں کو رخصت کر کے تمہارے پاس آتا ہے۔“

اس کے جانے کے بعد دلبر خان نے قہقہہ لگا دیا۔ ”ہم نے بولا تھا تا کہ یہ لوگ لڑکی کو کرسی نوٹ کی طرح چلاتا ہے۔“

حیدر علی اور سبحانی، دلبر خان سے گلے مل کر واپس روانہ ہوئے۔ واپسی میں حیدر علی نے کہا۔ ”ایس جی اتم بہت خوش قسمت ہو۔ تمہاری بیوی شیریں خوب صورت اور سلیقہ مند ہے۔ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت ہی محبت ہے۔ شیریں کی قدر کرنا۔ اسے بھی تکلیف نہ دینا۔“

”اچھا استاد جی بلکہ شیریں کے بڑے بھائی صاحب۔ ایسا ہی ہوگا۔“ ایس جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

☆☆☆

تیسرے دن حیدر علی اپنے پاس لگی کے سامنے بیٹھا کابل کی روداد سن رہا تھا۔ ”باس! آپ نے مجھے اختیار دیا تھا کہ میں پانچ پرسنٹ تک ریٹ بڑھا سکتا ہوں۔ میں نے تین پرسنٹ پر پابندی کو آمادہ کر لیا ہے۔ ہفتہ دن میں ہمیں شپ کی مل آف لینڈنگ مل جائے گی۔“

کہ اس سال قربانی کی عید پر بہت کم جانور آیا۔ اس لیے ہم کو گاؤں گاؤں جا کر کھالیں اکٹھی کرنا پڑا۔ اس میں بہت خرچہ مرچا ہوا۔ آپ کی کمپنی تھوڑا سا ریٹ بڑھا دے تو ہم تیس ہزار کھالیں چھوٹے جانور کی اور بیس ہزار بڑے جانور کی آپ کو پلائی کر سکتا ہے۔ پر آپ کو ریٹ بڑھانا ہوگا۔ ڈرائی فروٹ پرانے ریٹ پر ہی پلائی ہوگا۔“

حیدر علی نے کہا۔ ”خان صاحب! بات یہ ہے کہ میرے اختیار میں صرف دو پرسنٹ ہے، وہ میں بڑھا سکتا ہوں۔“

”علی صاحب! ایک بات کرو۔ تین پرسنٹ پر ڈن کر دو۔ ہم اپنے پائینڈز کو راضی کر لے گا۔ سب کھالیں کیسٹیکل لگا کر اسٹور میں تیار ہیں۔ آپ ڈن کرو۔ کیل بی مال کنٹینر میں لوڈ ہونا شروع ہو جائے گا اور ایک ہفتے میں کراچی بار بر پرنٹج جائے گا۔ بولکویا کہتے ہو؟“

علی نے ہاتھ بڑھایا۔ ”ڈن۔ پلائی میں ذیری نہیں ہوتا چاہیے۔“

”ذیری نہیں ہوگا۔ یہ خان کا وعدہ ہے۔ اطمینان رکھو۔“ علی نے کہا۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو بقا یا رقم اس وقت ملے گی جب شپ ہارنر کابل آف لینڈنگ ہو جائے گا۔“ (شپ ہارنر کی رسید کہ مال شپ ہارنر ہو گیا ہے)۔

”ضرور، ضرور علی صاحب۔ یہ تو بہت ضروری ہے۔ کراچی ہارنر پر بھی ہمارا آدمی لوگ ہے۔ وہ ٹائف مال شپ کرادے گا۔“

تینوں نے ہاتھ ملایا۔ دلبر خان نے کہا۔ ”اب تم کو ایک تماشا دکھاتا ہے۔ آپ میرے آفس میں جا کر بیٹھو۔“ حیدر علی اور ایس جی سبحانی اس کے آفس میں جا کر بیٹھ گئے۔ آفس ٹیبل کے علاوہ وہاں ایک کونے میں چار صوفے تھے۔ بیچ میں چھوٹی سی میز تھی۔

تھوڑی دیر میں دلبر خان ایک امریکن جوڑے کو لے کر اندر داخل ہوا۔ سب کا تعارف ہوا۔ لڑکے کا نام جوزف تھا اور لڑکی کا میگی۔ دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔

دلبر خان نے الماری سے تاش کی کئی سیلڈ گڈیاں نکالیں اور جوزف کے سامنے رکھ دیں۔ ”مشر جوزف! آپ گڈیوں کو چیک کر کے ایک گڈی سلیکٹ کر لو اور خود ہی پچے ڈسٹری بیوٹ کرو۔ گیم پانچ ڈالر سے شروع ہوگا۔“

پہلا گیم دس منٹ تک جاری رہا۔ جوزف بازی جیت گیا۔ دوسرا اور تیسرا گیم بھی جوزف جیتا۔ دلبر خان چالیں ڈال رہا تھا۔ میگی جوزف سے چکی بیٹھی تھی اور بہت خوش تھی۔

کھنڈر بن چکا ہے۔ تمہارے دوست غلام سُب ہانی کو سچ سمجھو کہ وہ فوراً پوری فیملی کے ساتھ کراچی یا تہران کی طرف نکل جائے۔ ایسا محنتی جوان ہے۔“

حیدر علی نے کہا۔ ”باس! غلام سبحانی کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کی فطرت انگریزوں سے بالکل مختلف ہے۔ انگریز اور اپنے اسناف کی کیڑ کرے؟ نامکن! امپوسٹیل۔ غلام سبحانی بالکل محفوظ ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کراچی پہنچ چکا ہے۔“

کلی کو بولنے کے لیے ایک ناپکسل گیا۔ ”علی! اشیاء تمہیں معلوم نہ ہو، میرے قادر برش آرمی سے ممبر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ انہوں نے دوسری جنگ عظیم میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ جب موڈ میں ہوتے تھے تو جنگ کے زمانے کے قصے سناتے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ اتحادی افواج میں کئی ملکوں کے جوان تھے مگر محاذ پر جس بہادری اور دلیری سے انڈین لڑتے تھے، اس کا جواب نہیں۔ خاص طور پر انڈین مسلمان اور سکھوں کی بے خوفی کا جواب بھی۔ علی اتم برا مت منانا اس وقت پاکستان نہیں بنا تھا اس لیے سب ہندوستانی یا انڈین کہے جاتے تھے۔ ایک محاذ پر میرے قادر شدید زخمی ہو گئے تھے۔ آٹھ ہندوستانی جوانوں کے ایک گروپ نے میرے قادر کو اٹھایا اور برستی گولیوں اور رٹر گولیوں میں وہ کسی نہ کسی طرح قادر کو فیلڈ میڈیکل کیپ تک لے گئے۔ صرف تین انڈین جوان کیپ تک صح سلامت پہنچ سکے، باقی راستے میں مارے گئے۔ میرے قادر نے نصیحت کی تھی کہ انڈین اور پاکستانیوں کی ہمیشہ قدر کرنا۔ یہ بڑے محنتی ہوتے ہیں۔“

کلی نے سگار کا لمبا کش لیا اور خوبدوار دھواں نکلا۔ ”ہاں علی! تم اس سُب ہانی کے بارے میں کیا بتا رہے تھے؟“

”سرا! آپ بھول رہے ہیں، آپ نے ہی غلام سبحانی کو دو ماہ کی چھینیاں دی تھیں۔ وہ پھمیلی کے ساتھ کراچی پہنچ چکا ہے۔“

”اوہ! اصل میں میری چھینی حس نے میرے دماغ میں کھینچ لی تھی کہ اب کامل کو بھول جانا چاہیے۔ اگر یہ دارلارڈز کچھ عرصے اور لڑتے رہے تو باہر کی طاقتیں لڑائی میں شامل ہو جائیں گی۔ چپک پاکستان کی طرف بھاگتا شروع ہو جائے گی۔ ہم ہائیڈرائڈ اسکن اور ڈرائی فروئس پر ان سے اپورٹ کر سکتے ہیں۔“

کلی نے سگار کا کش لگا لیا۔ ”گنڈ۔ گنڈ۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں وہاں بھیجا تھا۔ مجھے معلوم ہے افغانیوں سے پیسے کے معاملے میں ڈیل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تمہارا تیش ایوارڈ لپکا ہوا۔ ہاں علی! وہاں سے کتنے پاؤنڈ چرس لے کر آئے ہو؟“

حیدر علی نے قہقہہ لگایا اور اس کے سامنے آدھا کلو پستوں کا پیکیٹ رکھ دیا۔ ”تھینک یو علی۔ بسے اچھے اور بڑے ہیں۔ میری گرل فرینڈ بسے بہت پسند کرتی ہے۔ علی! ان میں چرس تو نہیں بھری ہوئی ہے؟“

علی ہنسنے ہوئے کلی کے کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے ہی دس سال گزر گئے۔ حیدر علی ایک نئی اور دو بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ بچے اسکول جانے لگے تھے۔ اس کی مالی حالت کافی مستحکم ہو گئی۔ اب وہ ایک سپر شاپری پارامنٹ کا مالک تھا۔ اس نے کراچی میں ناظم آباد کے علاقے میں ایک ڈبل اسٹوری مکان خرید کر اپنی والدہ کو منت کیا تھا۔ حیدر علی اور نوشا بہر لحاظ سے مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

ایک دن وہ دفتر میں بیٹھافون پر پارٹیوں سے ڈیل کر رہا تھا۔ اس کی سیکریٹری دست دے کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مستر علی! تم دن بے دن کینی کے لیے موسٹ اپورٹنٹ، ہیڈ موسٹ وائنڈ آفسیر بننے جا رہے ہو۔ کئی بہت پریشان ہے۔ اس نے کہا کہ سب کام چھوڑ کر علی کو میرے پاس بھجوا دو۔“

حیدر علی نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب کیا آفٹ آگئی ہے۔ یہ کیسی مجھے ایک منت بھی جین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔“

کلی بہت سنجیدہ موڈ میں تھا۔ اس نے علی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”علی! تم خبریں سنتے ہو، دیکھتے ہو یا پڑھتے ہو۔ یقیناً تم نے وی پر یہ خبریں دیکھتے ہو گے نہ اخبار پڑھتے ہو گے۔ پاکستانیوں میں یہ عادت بہت بڑی ہے۔ مجھے دیکھو ہر میسجی اخباروں کے علاوہ دو کتابیں ضرور خریدتا ہوں۔ میری گرل فرینڈ تو والدوں کی رہا ہے۔“

کلی نے اسٹاپ کیا اور سگار کا لمبا کش لیا۔ ”خیر! تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ بہت پہلے افغانستان کا کنگ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب وہاں صورت حال یہ ہے کہ افغانی دارلارڈز آپس میں لڑ رہے ہیں۔ کامل آدھے سے زیادہ

کے سامنے رکھ کر چلی گئی۔

یہ لفافہ راجنٹ میل سے فیلا سے آیا تھا۔ لفافے سے ایک لمبا چڑا خط نکلا جو اردو میں تھا اور شیریں بھائی کی طرف سے تھا۔ خط کالب لہاب پر تھا۔ ”حیدر بھائی! جلدی آئیے، میری مدد کریں۔ بہت پریشان ہوں۔ آپ کے دوست کچھ کل کھلانے پر تے ہوئے ہیں۔ مجھے کچی جڑی ہے کہ بھائی امرین شہریت کے لالچ میں صومالی سے شادی کر رہے ہیں اور مجھے طلاق کس قدر تکلیف دہ لفظ ہے۔ آفس سے ریزائن کر رہے ہیں اور صومالی کے ساتھ امریکا جا رہے ہیں۔ کئی کنی دن تک گھر نہیں آتے۔ بچے ان کے انتظار میں روتے رہتے ہیں۔ آپ خود کا دامط، جلدی آئیے۔“

خط پڑھ کر حیدر جی سناٹے میں آ گیا۔ اس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا ”الو کا بھنا۔“ بھائی تم واقعی الو کے بھٹے ہو۔ مجھے سے کہتے تو تمہیں نیو یارک یونٹ میں پوسٹ کر دیتا۔ حیدر علی نے بھنگا کر زور سے آاردی۔ ”ایس، ایس۔“ ایس گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ”مسٹر علی! خیریت؟ آج تک آپ نے اس لہجے میں آواز نہیں دی۔ آپ کے چہرے پر سرجی دیکھ رہی ہوں۔“

حیدر علی کو احساس ہوا۔ ”آئی ایم سوری۔ ہاں میں پریشان ہوں۔ تم میری مدد کر سکتی ہو۔ گرم کافی، نوشوگر، نوکریم۔“ ”ابھی لائی پاس۔“ ایس لہرائی ہوئی نکل گئی۔ کافی پیتے ہوئے حیدر علی سوچتا رہا پھر اٹھ کر کچی سے ملنے چلا گیا۔ اس نے کئی کو ہر بات پوری سچائی کے ساتھ متادی اور مشورے کا طالب ہوا۔

کئی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”علی! تم فوراً فیلا روانہ ہو جاؤ۔ وہاں آفس کے معاملات کو سنبھالو۔ اگر سب بھائی اور اس کی سیکریٹری جاب چھوڑنا چاہتے ہیں تو انہیں فوراً چلتا کر دو۔ یہ اصول ہمیشہ یاد رکھو کہ ان ولگ (un-willing) دو کر کر کو فوراً رخصت کر دینا چاہیے۔ وہ نہ... خود کو کم کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ جاؤ، میری طرف سے فری پینڈ ہے۔“

☆☆☆

حیدر علی فیلا ائر پورٹ سے سیدھا غلام بھائی کے گھر پہنچا۔ شیریں اسے دیکھ کر رونے لگی۔ ”علی! بھائی! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ بچوں کے گنے دتے روتے بیٹھے گئے ہیں۔ علی بھائی! ایس کیا کروں؟“

شیریں نے ایک بڑا لفافہ علی کے سامنے رکھ دیا۔ لفافے میں پاکستانی انیمسی سے تصدیق شدہ طلاق نامہ

کئی خاموش ہو کر سگار کے کش لینے لگا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کئی نے کہا۔ ”فلپائن، فیلا میں ہمارا چھوٹا سا یونٹ ہے۔ وہاں کا انچارج ریٹائرڈ ہونے والا ہے۔ تم اس سب بھائی کو فیلا میں پوسٹ کر دو۔ اچھا محتفی جوان ہے۔ دوسرا کام یہ کرو کہ میرے آفس سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ کچھے فون پر اپنی نئی گرل فرینڈ سے باتیں کرنی ہیں۔“

کئی اور علی دونوں نے قہقہہ لگا دیا۔

☆☆☆

علی نے اپنے آفس میں داخل ہوتے ہی ایس سے فیلا یونٹ کی فائل طلب کی اور اس کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ کمپنی نٹوں کے حساب سے وہاں پائی جانے والی خاص معمولی، میکڑے اور بڑے سائز کے جینیکل اپورٹ کرتی تھی اور دینی پہنچاتی تھی۔ عرب ممالک میں اس معمولی کی بڑی ڈیمانڈ تھی۔ فیلا میں کمپنی کا چھوٹا یونٹ تھا۔ انچارج مارٹن جو ریٹائر ہو رہا تھا، سیکریٹری صومالی جو مسلمان تھی، تیسرا فرد آؤٹ ڈور کام کے لیے تھا۔

فائل اچھی طرح پڑھ کر علی نے ٹائم دیکھا۔ پاکستان میں اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ بھائی سے فون پر بات کرنے کا مناسب وقت تھا۔ حیدر علی نے فون پر بھائی کو پوری طرح بریف کیا اور جلد از جلد فیلا پہنچنے کی ہدایت کی۔ ایک ہفتے کے بعد ایس جی بھائی نے فیلا پہنچ کر چارج لیا۔ اس کی فائل بھی ساتھ تھی۔ 9 سالہ بیٹی اور 6 سالہ بیٹا۔ شیریں اور بھائی بہت خوش تھے۔ بھائی علی کا شکر گزار تھا کہ کابل کا سیٹ اپ بند ہونے کے بعد کمپنی نے اسے فارغ نہیں کیا اور اچھی جگہ پوسٹ کر دیا۔

حیدر علی کئی دفعہ فیلا کا وزٹ کر چکا تھا۔ سیکریٹری صومالی نہایت خوب صورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں سحر تھا۔ جسم دلا لیکن پرکشش تھا۔ وہ امریکن شہریت کی حامل تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو سال اور گزر گئے۔ اس دوران حیدر علی نے فیلا کا ایک اور چکر لگایا۔ کمپنی کا آفس فیلا کے پوس علاقے میکائی میں تھا۔ حیدر علی نے فیلا آفس میں ایک بات نوٹ کی۔ بھائی نے اپنی نوجوان خوب صورت سیکریٹری سے کچھ زیادہ ہی یکسٹری ملالی تھی۔ روزانہ صومالی کے ساتھ لچ کرنے جاتا تھا، ویک اینڈ پر دونوں مووی دیکھنے جاتے تھے۔

وہ لندن میں ایک دن اپنے آفس میں بیٹھا کچھ مسائل پر غور کر رہا تھا۔ سیکریٹری اندر داخل ہوئی اور ایک لفافہ اس

حیدر علی نے فون پر سہیل فاروقی سے شیریں کے بارے میں تفصیل سے بات کی۔ سہیل فاروقی نے کہا۔ ”سید صاحب! اگر یہ رشتہ آپ کی نظر میں مناسب ہے تو سو فیصد منسوب ہوگا۔ میں شیریں کے بچوں کا سگے باپ کی طرح خیال رکھوں گا۔ آپ بات آگے بڑھائیں۔“

دوسری طرف حیدر علی نے شیریں، اس کے والد اور والدہ سے سہیل فاروقی کے بارے میں تفصیل سے بات کی۔ سہیل فاروقی نے بھی شیریں کے والدین سے بات کی۔ فاروقی کی چھوٹی شادی شدہ بہن کراچی میں رہتی تھی۔ فاروقی نے اپنی بہن کارنل فرسز دیا۔

دو مہینے میں یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ سہیل فاروقی کراچی پہنچا اور شیریں کو بیاہ کر لندن لے آیا۔ بچے بھی ساتھ تھے۔ فاروقی کی بچی کو ماں کی گود میسر ہوئی۔ دونوں پارٹیاں اپنی اپنی جگہ خوش اور مطمئن تھیں۔

حیدر علی نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

بہت عرصہ گزر گیا۔ حیدر علی ریٹائر ہو گیا۔ نوشاہہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بیٹے گارمنٹ بزنس میں مشغول تھے۔ بیٹی بھی اپنے گھر میں خوش تھی۔ ہر دوسرے ویک اینڈ پر سب بچے حیدر علی کے اپارٹمنٹ میں جمع ہوتے تھے۔ حیدر علی پوتوں، پوتی اور نو اسوں کو ہلاتا کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔

سنڈے کی صبح تھی۔ حیدر علی کے گھر کے لینڈ لائن فون کی سیل گھنٹائی۔ دوسری طرف ایس تھی۔ وہی گھنٹکی ہوئی آوار۔ ”گنڈا رنگ مائی پریویس ڈارنگ باس! آپ کی سابقہ سیکرٹری آپ سے مخاطب ہے۔ آپ کے پرانے دوست مسٹر غلام سب ہانی کی ایک ای میل آپ کے لیے آئی ہوئی ہے۔ میں نے پرنٹ آؤٹ نکال لیا ہے۔ آپ کے پاس بھجوا رہی ہوں۔ گنڈا ہانی۔“

شام کی ڈاک سے حیدر علی کو پرنٹ آؤٹ مل گیا۔ ایس جی نے لکھا تھا۔ ”علی بھائی! میں سخت بیمار ہوں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ سخت تکلیف میں ہوں۔ یہاں آکر مجھ سے مل لیجئے۔ ماضی بات کرتی ہے۔ مرتے ہوئے آدمی کی التجا قبول کریں۔ میرا پتا یہ ہے۔“

پتا نیو یارک میں لوگ آئی لینڈ کا تھا۔ نزدیک ترین ایئر پورٹ لاگاریا (La-Garia) تھا۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ اسٹرلنگ ایئر لائن لاگاریا ایئر پورٹ پر لینڈ کرتی ہے۔ حیدر علی نے اسی سے سفر کیا۔ یہ سات گھنٹے کی فلائٹ تھی۔

تھا۔ اسلامک سینٹر میں رجسٹرڈ سہیل فاروقی کا نکاح نامہ تھا۔ دونوں کے استغفوں کی کاپیاں تھیں اور شیریں کے مہر کا ایک چیک تھا۔

حیدر علی نے تمام بچہ زکا بنوڑ مطالعہ کیا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”شیریں بھائی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ شخص اتنا ذلیل نکلے گا۔ اس نے اپنی جوانی بھٹی کا بھی خیال نہیں کیا۔ بھائی! آپ حوصلے سے کام لیں۔ بچوں کو سنبھالیں۔ آپ نے مجھے بھائی کہا ہے۔ میں بھائی بن کر دکھاؤں گا۔ آپ کی تمام پریشائیاں میری پریشائیاں ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ بچوں کو لے کر اپنے والدین کے پاس کراچی چلی جائیں، میں آپ کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور غروں گا۔“

آفس جا کر حیدر علی کو معلوم ہوا کہ سہیل فاروقی اپنی فی بیوی کے ساتھ امریکا روانہ ہو چکا ہے۔ حیدر علی نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ اس نے نئی سیکرٹری اپائنٹ کی اور دو مہینوں میں کام کو پوری طرح سیٹ کر دیا۔

شیریں بچوں کے ہمراہ کراچی پہنچ چکی تھی۔ حیدر علی نے فون پر شیریں اور اس کے والد سے بات کی اور ان کو بتایا کہ شیریں کے عقد ثانی کے لیے اس کی نظر میں نہایت مناسب رشتہ ہے۔ اس سلسلے میں جلد ہی آپ سے بات کروں گا۔

☆☆☆

لندن میں ایک پاکستانی سہیل فاروقی، حیدر علی کے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ انھوں کے امراض کے ماہر تھے۔ بڑے آئی اسپتال میں آئی سرجن کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فاروقی آپٹیکل کے مالک تھے جس کی کئی شاخیں لندن، مانچسٹر اور لیڈز میں تھیں۔ مہینے میں بیس آپریشن بالکل فری کرتے تھے۔ اسپتال کے دیگر اخراجات بھی اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ”سید صاحب! میرے بیٹے کی رلوا ہے۔“ وہ حیدر علی کو ہمیشہ سید صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

ان کے ساتھ ایک ماہ بیلے بڑی تربیڈی ہوئی۔ اس کی وائف ڈیویری روم میں ایک بچی کو جنم دے کر انتقال کر گئیں۔ بچی ترسک ہوم میں پرورش پاری تھی۔ سہیل فاروقی بہت پریشان تھے اور کئی دفعہ حیدر علی سے کہہ چکے تھے کہ اس مسئلے کا حل نہ لیں۔ حیدر علی کی نظر میں شیریں کے لیے یہ مناسب رشتہ تھا۔

لگا۔ دن رات لگاتار۔ تھکتا مگر بالکل حتم ہو گیا۔ علی سہائی اچھے پراحسان کرو۔ مجھے تیریں سے معافی دلوا دو۔“

حیدر علی کچھ نہیں بولا۔ اس نے اپنے سیل پر سہیل فاروقی کو نمبر ملایا۔ یوری تفصیل بتا کر کہا کہ بھائی شیریں سے معافی کا طلب گار ہے۔

فاروقی نے کہا۔ ”سید صاحب! یہ شیریں کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں فون شیریں کو دیتا ہوں۔“

فون پر شیریں کی آواز آئی۔ علی نے کہا۔ ”شیریں! ایہ قریب المرگ ہے۔ تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ شیریں! اسے معاف کر دو۔ لو بات کرو۔“

علی نے فون سہائی کے کان میں لگا یا۔ شیریں کی آواز سن کر اس نے کہا۔ ”شیریں! میں معافی کے قابل نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

شیریں نے کہا۔ ”تم نے بچوں اور مجھ پر بہت ظلم کیا ہے۔ علی بھائی کے کہنے پر میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔“ اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔

حیدر علی نے سیل اس کے کان سے ہٹا لیا۔

سہائی کے چہرے پر اب اطمینان تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ علی خاموشی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح علی لندن پہنچ چکا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا مگر اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا میرے مولا، میں اسی سال کا ہو چکا ہوں۔ صحت مند اور جاق و چوبند۔ میرے مولا نے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسی سال نہیں صرف اسی منٹ کی! ایک نئی جوبلی بھر میں گزر گئی۔ میں نے یہ ایک بہت اچھی طرح کیٹلی۔ یہ بھی تیرا کرم ہے۔

اس کی سوچ کا دھارا ٹوٹ گیا۔ دروازے کی تیل بجی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے اس کی ایک بہو کیک کا بڑا سا ڈالیے کھڑی تھی۔ ساتھ ہی اس کے دو پوتوں اور پوتی نے اس پر دھاوا بول دیا۔ ”دادو! اپنی برتھ ڈے نو یو۔“ علی نے سب کو پٹ لیا۔

بہو نے کہا۔ ”ابو! لوگ بھی آرہے ہیں۔ آج سے آپ اکیاسی سال میں داخل ہو گئے، آپ کو مبارک سو۔“

حیدر علی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ بے شک! اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔

حیدر علی سیدھا لانگ آئی لینڈ میں سہائی کے بچے پر پہنچا۔ یہ سات منزلہ عمارت جی میں متعدد فلیٹس تھے۔ فلیٹ نمبر 402 پر پہنچ کر اس نے تیل بھائی اور کئی دفعہ بھائی۔ اندر کوئی نہیں تھا۔

اسنے میں برابر والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت نے جھانکا۔ ”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”مسٹر سہائی سے۔“

”اوہ۔ وہ تو ایل آئی کینسر اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ پرسوں ہی چھٹی مرتبہ اسپتال آئے ہیں۔ ان کی کنڈیشن ہوئی لیس ہے۔ انہیں جگر کا کینسر ہے۔ جب جگر میں پن ہوتا ہے تو مسٹر سب بانی بری طرح چیخنے لگتے ہیں۔ ہم لوگ نائن ون دن کوفون کر کے انہیں اسپتال بھجوا دیتے ہیں۔ ویسے پچھلے تین سال میں آپ پہلے آدمی ہیں جو ان سے ملے آئے ہیں۔“

”ان کی وائف صومالی؟“

”ان کو ہم نے کئی سال سے نہیں دیکھا۔“

حیدر علی نے عورت کا شکریہ ادا کیا اور اپنا چھوٹا سا ہینڈ کیوری اٹھا کر بلڈنگ سے باہر آ گیا۔

ایل آئی کینسر اسپتال پہنچ کر حیدر علی نے کانٹر پر اپنا تعارف کرایا اور مسٹر سہائی اور ان کے ڈاکٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

کانٹر گرل نے بتایا کہ مسٹر سہائی تھریڈ فلور پر کمر انمبر 304 میں ہیں۔ ڈاکٹر اسمتھ ان کو ریٹ کر رہے ہیں۔ وہ اسی فلور پر روم نمبر 35 میں مل جائیں گے۔

ڈاکٹر اسمتھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”مسٹر علی! آپ پہلے آدمی ہیں جو مسٹر سب بانی کو دیکھنے آئے ہیں۔ ان کی کنڈیشن بہت خراب ہے۔ جگر تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ صرف بائج دس پرسنٹ کام کر رہا ہے۔ کسی وقت بھی ان کی ڈیٹھ ہو سکتی ہے۔ آپ روم نمبر 304 میں چلے جائیں۔“

حیدر علی، سہائی کے کمرے میں داخل ہوا۔ میڈیکل ہیڈ پر ایک ڈھانچا لٹا ہوا تھا۔ جسم میں ٹیوبس اور دو ڈریسنگ ٹی ہوئی تھیں۔

آہٹ بن کر ڈھانچے نے آنکھیں کھولیں۔ حیدر علی کو پہچان کر اس کی پلکوں سے آنسو چمک پڑے۔ ڈھانچے نے نحیف آواز میں کہا۔ ”علی بھائی! آپ کا شکریہ۔ آپ آ گئے۔ مجھے بہت تکلیف ہے مگر موت نہیں آتی۔ پتا نہیں حان کہاں اٹکی ہوئی ہے۔ میں نے شیریں اور بچوں پر بہت ظلم کیا۔ صومالی چند سال بعد ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں تڑپ پینے